مسلک دیوبند چودھویں صدی کی پیداوار ہے
محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی سے پہلے
کسی مسلمہ شخصیت سے ان کا تعلق نہیں

(دارالعلوم دیوبند کے شیخ کا اعتراف)

۳۴۶

مولانا سید انظر شاہ صاحب — استاذ تفسیر دارالعلوم۔ دیوبند

مسلکِ دیوبند کیا ہے؟

ادارہ البلاغ کا مضمون کے ہر ہر جزء سے مکمل اتفاق ضروری نہیں

حکم ہے ایک عزیز مکرم کا جو غالباً عمر میں کم اور علم و ذکاوت، فہم و دانش میں بڑا اصل آگے ہیں، کہ اکابر دیوبند پر ان کے سو فرقے کے لئے کچھ لکھوں، لیکن سوچتا ہوں کہ اکابر کے تعارف سے پہلے، تو دیوبندیت ہی کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ پتے اور کونپل۔ رگ و ریشے۔ شاخیں اور ان کا لمبا سلسلہ سب کچھ جڑ ہی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، اگر اصل ہی مشخص و متعین نہیں تو برگ و بار کی تعریف و تعارف، حقیقت کی دریافت کی وافی و کافی راہ نہیں۔ مضمون زیر قلم ہے تو عمر چالیس کے سن و سال سے آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ بات اگرچہ اس دور میں بھی وہی ہے، جو کریما کے مصنف نے غالباً مجھ ایسوں ہی کے لئے کہی تھی کہ

> چہل سال عمر عزیزت گزشت
> مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

تاہم جو کچھ ہوا وہ ہوا اور جو ہونا ہے وہ بھی ہو کر رہے گا۔ اتنا تو بطور تحدیث نعمت عرض کرنے کی ہمت رکھتا ہی ہوں کہ اب رد و قبول کا معیار بحمداللہ شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ ہے، یعنی جو کچھ پہنچا اور پہنچیگا، عقل کی کسوٹی اسے خود بھی پرکھ کر دیکھنے کا جذبہ وافر رکھتی ہے، گویا کہ ابھی وشعور معطل نہیں، بلکہ اپنے گے بندھے کام میں مصروف ہیں، قرآن۔ حدیث، نبی اور پیغمبر، دین و ملت، فقہ و روایت، بلکہ حد تو یہ ہے کہ اپنے اسلافؒ کے بارہ میں جو کچھ سنتا اور سن رہا ہوں خوب ٹھونک بجاکر، اسے قبول کرنے کی عادت پڑ چکی، یہ کلپترہ گوئی بھی، وہ مدح خودگی کوئی جلی و خفی شکل نہیں بلکہ آنے والے بیانات و حقائق کو قابل قبول بنانے کی ایک معقول تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پڑھنے والے اور سننے والے، بعض یہ کہہ کر، تحریر کو ہاتھوں سے نہ رکھ دیں کہ دادا کا

؎ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے جس سے غالباً کچھ سوچنے اور سمجھنے کا جو ڈھنگ اپنا نا ہے اس کی کوئی خاص شکل آپکے سامنے آئے کہ غدر کی معروف جنگ جس میں براہ راست علماء وقت بھی شرکت کر رہے تھے۔ اپنے اکابر سے بارہا سنا کہ جس وقت حضرت حافظ ضامن الشہید رح شہادت کے مقام ارفع پر فائز ہوگئے تو غالباً سید الطائفہ حضرت الحاج مولانا امداد اللہ قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ "بس اب جنگ لڑائی ختم، وہ تو خدا تعالیٰ کو حافظ جی کے شوق شہادت کی تکمیل مقصود تھی جو یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہوا وہ ہو چکی اب لڑائی کی بھی کیا ضرورت" پھر انہیں اکابر سے مسلسل یہ بھی سنتا رہا کہ ٹھیک حافظ صاحب کی

ایک طومار اور مرویات کا پلندہ ہے۔ ایسا نہیں، بلکہ فراغت کے برائے نام ہی کہی بہرحال سترہ برس کے عرصہ کے بعد جس حد تک واقعات کی دریافت ممکن ہوسکی "جدوجہد" کے اسی حاصل کو سامنے لا رہا ہوں، کہنا یہ ہے کہ جس طرح اسلام، تمام ہی مذاہب میں، مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے بعد میرے لئے ایک دین برحق ہے، جس کے ایک ایک جزو پر خدا کا شکر ہے کہ ایمانداری کی دولت سے سرفراز ہوں، اسی طرح فقہی مکاتیب میں حنفی طرز کی جامعیت گہرائی و گیرائی پر ... دل و دماغ مطمئن ہیں دوسرے مکاتیب کی صحت و درستگی کے یقین کے باوجود حنفی فقہ کی ترجیح، علم و یقین کے درجہ میں حاصل ہے، بلکہ امام اعظم کے خصوصی تفقہ پر دل اسی وجہ مطمئن ہے، جیسا کہ استاذ الاساتذہ حضرت سیدنا شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے بارہ میں بتواتر سنا کہ جس قول میں امام اعظم کو منفرد پاتے، تا آنکہ ان کے مشہور تلامذہ ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ بھی ان کے ہمنوا نہ ہوتے، شیخ الہند علیہ الرحمۃ اس صورت حال پر بجائے، پریشان و پشیمان ہونے کے بے حد مطمئن رہتے، فرماتے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ بات اس درجہ دقیق، نازک اور عمیق تھی، جہاں تک سوائے ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کسی اور کی نظر پہونچ بھی نہیں سکتی تھی۔" او کما قال" بلکہ سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ جس مسئلہ کو حضرت مرحوم فقہاء کے مابین قطعاً اتفاقی پاتے، اس پر تشریح و تفصیل کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی یہ ارشاد فرماتے ہوئے گذر جاتے کہ

"چلو بھائی یہ بات تو اتنی سامنے کی ہے کہ سب ہی کو نظر آگئی۔"

اس موقعہ پر سیدنا الامام مولانا انور شاہ کشمیری تغمدہ اللہ بغفرانہ کی وہ آخری تقریر بھی پیش نظر رہنی چاہیئے، جو آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے سالانہ اجلاس میں الوداعی فرمائی

(متعلقہ صفحہ گذشتہ) شہادت کے بعد جگہ جگہ بھڑکتے ہوئے شعلۂ جنگ اور لڑائی کے اس طرح بجھتے رہے جیسے کوئی پانی ان چنگاریوں کو ڈال رہا ہو۔ روایت تو سن لی، مگر دل ہمیشہ اس سے انکار کرتا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدائے عالم و حکیم کی تکوینیات و تقدیر محض ایک انسان کی خواہش و تمنا کے لئے اگرچہ وہ کتنا ہی مقبول و مکرم ہو، پورے ملک کو جنگ کے شعلوں اور آگ میں جھونک دے؟ لیکن جب قرآن مجید ہی کے سلسلہ درس و تفسیر کا موقع ارزانی ہوا تو احد کے واقعات میں یہ الفاظ آنکھوں سے دل میں اتر گئے، فرمایا۔ ویتخذ منکم شھداء" جس کا ترجمہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فرمایا ہے کہ "کرے بعضے تم میں شہید" آیت سے متعلق روایات میں آیا ہے کہ بعض وہ فدا کار جو بدر کے معرکہ میں شرکت نہ کر سکے تھے اور جنہیں احد کے کارزار میں شوق شہادت اور رگ رگ سے خدا کے نام پر نکلنے والا بے قرار خون، کھینچ کر پہونچا تھا، احد میں ناکامی کے چھوٹے بڑے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بھی حکیم و علیم نے بتایا کہ اس طرح بعض سعید روحوں کی تمنائے شہادت کی تکمیل بھی مقصود و مطلوب تھی، پس یہ امت جس کا آخر بھی خیر سے خالی نہیں اور ان شاء اللہ کبھی ہوگا کیوں ممکن نہیں کہ قدرت بعض مقتدران کی بعض تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے، غدر جیسے ہنگامہ کھڑا کردے، شر میں خیر کا جو پہلو رکھ دیا گیا جس کو دیکھ کر کہنے والے نے کہا تھا "کہ خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے کسی کے لئے خیر کا دروازہ سیکڑوں کے لئے شر بنا کر بہرحال کھولا جا سکتا ہے، خوب کہا ہے کہنے والے نے۔ ؎

گر تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　می دہد یزداں مراد متقی

بہرحال حافظ ضامن صاحب سے متعلق روایت کو قبول کرنے میں کم از کم مجھے اب کوئی تذبذب نہیں، اولین میں اس طرح کی روایت اگر موجود ہے تو آخرین کے لئے امکان کو بھی نہ ماننا، عقل و آگہی کے بے مصرف کاموں کے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جس کے بعد پھر اس ناسوتی دنیا میں آپ کا قیام معدودے چند ماہ ہی رہا فرمایا کہ:

"ہم نے اپنی عمر کے چالیس سال محض اس مقصد کے لئے صرف کر دیئے کہ دیکھیں فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے یا نہیں، سو ہم اپنی چالیس سالہ محنت کے بعد قطعاً مطمئن ہیں، جہاں جس درجہ کی حدیث خصم کے پاس ہے اسی درجہ کی حدیث احناف کے پاس بھی موجود ہے اور جہاں حدیث نہ ہونے کی بنا پر امام ابو حنیفہ نے مسئلہ کی بنیاد قیاس پر رکھی وہاں دوسروں کے پاس بھی کوئی حدیث موجود نہیں۔"

یہ تفحص و تلاش نہ میرے لئے ممکن اور نہ بحالت موجودہ متوقع، تاہم اکابر کو جو کچھ یقین کد و کاوش سے میسر آیا کچھ بھی ہو اس ظلوم و جہول کو وہ دولت، الحمد للہ بہر حال حاصل ہے۔

اسی طرح ہندوستان اور بیرون ہند میں جس قدر نظریاتی اعتبار سے مکاتیب فکر و نظر پھیلے ہوئے ملتے یا ملتے رہے ان سب میں، دیوبندیت کی اصابت، اور حدیث و قرآن یا سنت و دین سے اس کی موافقت پر، شرح صدر کی دولت مجھے میسر ہے، ہر تعصب سے بالاتر ہو کر جس قدر میں نے غور کیا یا فکر و نظر کی جتنی راہیں مجھ پر کھل سکیں، دیوبندیت کو اسی دین کی ایک مکمل تصویر میں نے پائی جو مکہ اور مدینہ زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً سے، اپنی ابتدائی اور انتہائی، بلکہ ارتقائی شکل میں چلا تھا یہ ہے ایک مختصر جواب۔ تمہید میں اٹھائے ہوئے اس سوال کا کہ آخر دیوبند یا دیوبندیت ہے کیا چیز، ذرا تفصیل اور اس کی ہو جانی چاہئے تاکہ دیوبندیت اپنے تمام زوایا و گوشوں خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ دوسرے تمام مکاتیب فکر میں ممتاز ہو جائے۔

میرا خیال یہ ہے کہ "ما انا علیہ و اصحابی" جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اطہر سے، اسی سوال کے جواب میں تراوش ہوا تھا "نجات پھر کس فرقہ کی ہوگی؟" یہی دیوبندیت کی مختصر اور مفصل، جو جز اور مبسوط تعریف و تعارف ہے، پس میرے نزدیک، دیوبندیت خالص ولی اللّٰہی فکر بھی نہیں، اور نہ کسی خاص خانوادہ کی لگی بندھی فکر، دولت و متاع۔ میرا یقین ہے کہ اکابر دیوبند جن کی ابتداء میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اکبر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے، علم کامل، اور شعور بالغ کے ساتھ، قدرت نے ان کو ایک ایسی چھلنی بھی عطا کی تھی جس سے وہ افکار و نظریات کو چھان کر ہی قبول کر سکیں، مجھے اس حقیقت کے انکشاف کرنے میں کوئی تامل و تذبذب نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی سیاسی و مذہبی پامالی کے دور میں، دین کو اپنی شکل میں باقی رکھنے کے لئے، دیوبند کا وجود قدرت کا ایک عظیم لطیفہ ہے۔ اور جن اکابر کو، فکر و نظر کی تراش و خراش کے لئے خدا تعالیٰ نے کھڑا کر دیا، وہ عظیم انسانی، صدیوں کی الٹ پھیر میں، وجود پذیر ہوتے ہیں، اس لئے یہ دیوبندیت کی ابتداء، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ[1] کرنے کے بجائے، مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ہی منتہی ہوتا ہے۔ اور آج ہند و پاک میں حدیث و قرآن کے جو زمزمے سنے جاتے ہیں ان میں خانوادہ ولی اللّٰہی کا براہ راست دخل ہے۔ اس لئے

[1] چند سال گذرتے ہیں دارالعلوم دیوبند کے آفاقی کتب خانہ میں ایک باخبر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر، اچانک مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ دیوبندیت کیا ہے؟ اس کے جواب میں جب میں نے اپنی مذکورہ بالا دریافت ذرا تفصیل سے بیان کی تو سننے کے بعد وہ بولے کہ "مولوی صاحب" اس حقیقت پر تو اکثر دیوبندی بھی مطلع نہیں، اور کھینچ تان کر خود کو ولی اللّٰہی فکر سے جوڑ رہے ہیں، حالانکہ دیوبندیت کے امام تو صرف یہی دو امام وقت ہیں ۱۲

ان کی خدمات جلیلہ کا انکار نہیں ہو سکتا۔ تاہم کم از کم مجھے تو شاہ صاحب اور دیوبند میں فرق نمایاں اور واضح نظر آتا ہے جس کے بعد، دیوبندیت کو، ولی اللّٰہی فکر کا ایک سرچشمہ قرار دینے میں مجھے تامل ہے، بلکہ میرے اپنے مطالعہ کا حاصل تو یہ ہے کہ، دیوبندی فکر سے بہت کچھ حضرت رئیس المحدثین شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ قریب ہیں۔ فقہ حنفی کی برتری کا یقین اور اس کی اشاعت جو دیوبند کے متعارف اجزاء ترکیبی میں ایک عنصر غالب ہے، جس قوت کے ساتھ شاہ عبدالعزیزؒ کے یہاں ہے، ان کے والد ماجد قدس سرہ العزیز کے یہاں اس کا نام و نشان بھی نہیں،[1] اگر ہے بھی تو نہایت گول مول بنا دیا

اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو شاہ صاحب مرحوم سے کم از کم مجھے دیوبند کو دور لیجا کر کھڑا کرتا ہے۔ "والقصۃ بطولہا"[2] اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کر دیوبندیت کے واقعی امام وہی دو بزرگ ہیں، جن کا نام آپ مجھ سے سن چکے "الحاج صوفی روشن ضمیر مولانا عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ دارالعلوم کے ابتدائی بانی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آفاقی اور عالمی درسگاہ کے تخیل سے مرحوم کا دل و دماغ قطعاً خالی تھا، ایک عظیم درسگاہ جو آفاقی تصور کی حامل ہو۔ کلیۃً حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مرہون منت ہے، نیز ابتدائی آویزشیں جو حضرت مولانا قاسم صاحب اور حاجی عابد حسین مرحوم میں رہیں، جن کی محتاط

---

[1] یہاں اپنے ایک پرانے خیال اور پھر اس میں تجربہ و آگاہی کے بعد تبدیلی کا ذکر بھی مناسب ہے، ایک مدت تک میرا خیال یہ رہا کہ دیوبند کو اپنا تعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے کیوں نہ قائم کرنا چاہیے۔ غالباً ہندوستان میں اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے حدیث کے سلسلہ میں ان کی خدمات کچھ کم وقیع نہیں، شروح حدیث میں شاہ صاحب مرحوم کے قلم سے جو کچھ جواہر پارے تیار ہوئے انہیں تو جانے دیجئے۔ ان کے صاحبزادہ شیخ نورالحق رح کی شرح بخاری بھی ایک زمانہ میں معروف و متداول رہی، اس خانوادہ کی خدمات علماء ولی اللّٰہی کے کتب کی طرح اگرچہ جلیل و وقیع نہیں تاہم حدیث و قرآن سے ہند کو واقف کرنے میں شیخ عبدالحق مرحوم کا بھی بہر حال حصہ ہے۔ مگر پھر یہ رائے بھی بدل گئی، اول تو اس وجہ سے کہ شیخ مرحوم تک ہماری سند ہی نہیں پہنچتی، نیز حضرت شیخ عبدالحق کا فکر کلیۃً دیوبندیت سے جوڑ بھی نہیں کھاتا۔ غالباً میری یہ بات بہت سوں کو چونکا دینے والی ہو مگر اس موقع پر میں ایک جلیل اور صاحب نظر عالم کی رائے میں اپنے لئے پناہ ڈھونڈتا ہوں۔ سنا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم فرماتے تھے کہ "شامی اور شیخ عبدالحق پر بعض مسائل میں بدعت و سنت کا فرق واضح نہیں ہو سکا" بس اسی اجمال میں ہزارہا تفصیلات ہیں جنہیں شیخ کی تالیفات کا مطالعہ کرنے والے خوب سمجھیں گے ۱۲

[2] میری ان تصریحات سے یہ سمجھنا کہ امام الدہلوی کی عقیدت میں یہ حقیر کسی سے کم ہے۔ مجھ پر ایک ظلم ہوگا کیا عرض کروں اپنی موجودہ حالت کو اسی امام وقت کا ایک روحانی فیض و تصرف باور کرتا ہوں۔ جس زمانہ میں یعنی ۱۹۴۳ء میں ہند و پاک کے دو ابھرے ہوئے خطوط سے پہلے دہلی میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی، اردو فارسی امتحان دینے کے بعد براہ راست انگریزی میں پڑھ چکا تھا، اور جن حالات میں اگر موت آجاتی تو غالباً "موت جاہلیۃ" ہی ہوتی۔ ہر جمعہ کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء اور سیدنا الامام الدہلوی کے پر انوار مزارات پر برابر حاضری ہوتی اور جو دعائیں ہوتیں ان کی تفصیل کے بغیر موجودہ شغلے انہیں بزرگوں کے روحانی تصرف تسلیم کرتا ہوں دوسروں سے منوانے کی کوئی جدوجہد بیشک نظر بھی نہیں، اب بھی دہلی کا کوئی سفر غالباً الامامؒ کے مزار پر حاضری کے بغیر نہیں ہوتا اور بارہ سال کے دن میں تین بار ایصال ثواب کا الحمدللہ معمول ہے، تاہم جو بات کہنا ہوں وہ ایک نہ ایک دن کہی جاتی ہی، بس اعتراضات و نکتہ چینی اور لومۃ لائم کے خطرہ سے بے نیاز ہو کر میں ہی کیوں نہ عرض کردوں ۱۲

تعبیر فکر رہی، یا شاہ جرات ہی سے ہو سکتی ہے، میرے نزدیک اس کی
واقعیت صرف اتنی نہیں کہ عمارت کے مختصر یا وسیع کرنے پر دونوں
بزرگوں کا اختلاف تھا، جیسا کہ میں اپنے بزرگوں سے برابر سنتا
رہا، مجھے عرض کرنے دیجئے کہ یہ آویزش خالص "نظریاتی جنگ"
تھی میں تفصیلات میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا اس لئے کہ وہ ایک
دلخراش تاریخ کا باب ہے، لیکن اپنے علم و مطالعہ کی بنیاد پر اتنا
ضرور عرض کروں گا کہ جو دیوبند، حضرت حاجی عابد حسین المغفور کی
زیر تربیت بن رہا تھا، وہ یقیناً اس دیوبند سے مختلف
ہوتا جس کا آج تعارف اور شہرت، عالم اسلامی[1] سے گذر کر اقصائے
عالم میں پہنچ چکی ہے۔ اس لئے تسلیم کرنا ہوگا کہ موجودہ عمارت
کے بانی ہونے کے ساتھ فکر اور تخیل کے امام بلا ریب حضرت مولانا
قاسم صاحب علیہ الرحمۃ ہیں، جن کی پوری جدوجہد میں حضرت
گنگوہی ثانی اثنین کی حیثیت سے ہر مرحلہ پر کھڑے نظر آتے
ہیں۔

---

[1] سمجھنے کے لئے صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ چھتہ کی مسجد جہاں سے دار العلوم کی ابتدا ہوئی ہے۔ حضرت حاجی صاحب
مرحوم کی نشست گاہ یہی مقدس عمارت ہے۔ اس مسجد میں رمضان المبارک کے چاروں جمعوں میں اب تک میلاد، حضرت حاجی
صاحب کی یادگار میں جاری ہے، میں نے کیا لکھا بس اسی اجمال میں، نکتہ سنج اسی ساری تفصیلات کو پڑھ لیں جسے میں نے
کم از کم تاریخ نگاری کے تلخ فریضہ کے قطعاً خلاف رسنانے سے پہلو بچا لیا۔